ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.4 2021

اشفاق احمد کی شخصیت کے مختلف پہلو

THE VARIOUS ASPECTS OF ASHFAQ AHMAD’S PERSONALITY

۱۔سیدہ طیبہ رباب
۲۔ڈاکٹرنازیہ پروین
۳۔ڈاکٹرعظمیٰ بشیر

Abstract:
Ashfaq Ahmad was born in a religious family but he felt loneliness and wanted to know about the wisdom of the east. he used to meet various mystical personalities and gave his deep and rich ideas about mysticism in urdu literature. He was not a mystical personality but had a spiritual approach and was a unique person. He had the great love for humanity which is reflected by his short stories, dramas, zavia and interviews even by his life. He was the beloved personality being a great writer.

کلیدی الفاظ: تنہائی، حساس، کالی بلی، فنکار، روم، خاموش، دانش مشرق۔

اشفاق احمد کی شخصیت کا جائزہ لینے کے لیے اُن کی زندگی کے حالات اور نفسیاتی عوامل کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔وہ ۲۲/اگست ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے،اُن کا پٹھانوں کے مہمند قبیلے سے تعلق تھا جو افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ان کا آبائی شہر ہوشیار پور کا چھوٹا سا گاؤں خانپور رہے۔اشفاق کے والد محمد خان وہیں پیدا ہوئے۔پرورش بھی وہیں ہوئی محمد خاں ڈی۔وی۔ایم تھے ان کی پہلی تعیناتی فیروزپور کے قصبے مکتسر میں ہوئی۔مکتسر سکھوں کا دوسرا بڑا متبرک مقام ہے وہاں ان کا بڑا گردوارہ بھی ہے۔مکتسر سے دریائے ستلج تینتیس میل دُور تھا۔خشک علاقہ تھا یہاں بارانی فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔جھنڈ، کریر، پھلاہی کے درخت عام تھے۔کہیں کہیں ٹاہلیاں بھی تھیں۔مکتسر کے قصبے میں ہجراہ داری پتی محلہ تھا۔اس میں ایک حویلی نما مکان اشفاق احمد کے والد کا تھا۔اشفاق احمد آٹھ بہن بھائی تھے جن میں اشفاق صرف ایک سے بڑے تھے۔سب بہن بھائی اسی گھر میں پیدا ہوئے اور یہیں پہ اِبتدائی تعلیم حاصل کی البتہ گرمیوں کی چھٹیوں میں خانپور چلے جاتے۔گلی ڈنڈا کھیلنا اور درختوں کی شاخوں پر جھولنا ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔بچپن کا ایک یادگار واقعہ جس کے ساتھ خوشی وابستہ ہے۔اشفاق احمد اس کا ذکر کرتے ہیں:

> ”میری ماں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے مرغی انڈوں پر بٹھائی ہے اس میں سے چوزے نکلیں گے۔میں نے پوچھا ”اماں کب نکلیں گے؟ انھوں نے اُنگلیوں پر حساب لگا کر بتایا کہ اتوار کو۔۔۔ ایک دن میں صبح اُٹھا ہفتے کا دن تھا میں نے اپنی تختی پر ”گلاب کا پھول“ مضمون لکھا اور سکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تبھی ماں نے مجھے بتایا کہ مرغی کے کچھ بچے نکل آئے ہیں اور باقی نکل رہے ہیں۔

I. اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، نڑوالا بنگلہ، ۶۱ ج ب، فیصل آباد
II. فیصل آباد
III. وزٹنگ اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

یہ سن کر میں رونے لگ گیا کہ آج تو میں سکول جا رہا ہوں ادھر یہ بچے اتوار کی بجائے آج ہی نکل رہے ہیں۔ اس پر میری ماں نے مجھے کہا کہ آج اتوار ہی تو ہے جس دن چوزے نکلیں ہفتہ نہیں اتوار ہوتی ہے یہ سن کر میں بہت خوش ہوا اور سارا دن چوزوں کے پیچھے بیوقوں کی طرح بھاگتا رہا، جس بچے کی تفریح مرغی کے سترہ بچے ہوں اس کے نزدیک کسی اور چیز کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔"(۱)

بچپن کا ایک اور واقعہ دلچسپ ہے۔ اُن کی ایک کزن ان کے گھر آئی مہینہ بھر اس کے ساتھ کھیلتے رہے جب وہ جانے لگی تو اس نے کہا شفو مجھے سٹیشن پر چھوڑنے نہیں جاؤ گے۔ بولے نہیں میں نہیں جاؤں گا اس نے بڑی منتیں کیں لیکن نہ مانے جب وہ چلی گئی تو اشفاق کے لیے بھرا گھر خالی ہو گیا وہ غیر محسوس انداز میں مبتلائے عشق ہو گئے گھبرا کر چھت پر گئے اور برساتی پہ چڑھ کر گاڑی کو دیکھنے لگے، جب گاڑی چھک چھک چلی تو ٹپ ٹپ اشفاق کے آنسو گرنے لگے خوف زدہ بھی تھے کہ ماں نہ دیکھ لے پھر ان کا معمول بن گیا کھیل چھوڑ کر روز اسی وقت چھت پہ جا کے روتے جب محلے کے ایک لڑکے کو اشفاق کی اس کیفیت کا علم ہوا تو اس نے بتایا کہ تمھیں پتہ ہے تمہیں اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے۔ اس واقعے نے اشفاق کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیا وہ مُدّتوں اس محبت کے زیرِ اثر رہے۔

اشفاق کی والدہ اس دور کی روائتی ماں تھیں جن کی متاعِ حیات ان کی اولاد ہوتی تھی۔ اولاد سے بھرپور محبت کرنے والی اور اللہ سے ڈرنے والی ماں کی فطری سادگی اور تربیت کے متعلق لکھتے ہیں:

"آج اگر بچے سے کوئی چیز زمین پر گر جائے تو اس کی ماں رسالے سے نگاہیں اُٹھا کر ہوں ہوں کر کے کہتی ہے بُری بات ہے زمین سے اُٹھا کر منہ میں نہیں ڈالنا۔ جراثیم لگ گئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ سے اگر شاہی ٹکڑا چھوٹ کر کچے فرش پر گر جاتا اور ہم اسے اُٹھا کر پھر کھانے لگتے تھے تو اماں دُور ہی سے جوتی اُٹھا کر کہتی تھیں ناشکرے، ندیدے پہلے چوم کر اور پھر ماتھے کو لگا کر کھاؤ۔ رزق کی بے عزتی کی تو جان نکال دوں گی۔ وہ جراثیموں سے زیادہ خدا سے ڈرتی تھیں۔"(۲)

بچپن سے ہی دینی ماحول میں تربیت رہی ان کی شخصیت پہ اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ رسمی تعلیم سے پہلے درسِ نظامی کا کورس کیا۔ اشفاق احمد محنتی طالبِ علم نہ تھے جیسا کہ اکثر ذہین لوگ لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اشفاق بھی ایسے ہی تھے اسی وجہ سے میٹرک میں ایک بار فیل بھی ہوئے۔ ان کا حساب کمزور تھا لیکن شعری ذوق اچھا تھا اور پہلا افسانہ بھی اسی عمر میں لکھا۔ ہر شام غالب کی شاعری ارد گرد کے لوگوں کو سناتے جو اس کی سمجھ نہیں رکھتے تھے بقول اشفاق ڈاکٹر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے لحاظ کرتے اور سنتے رہتے یہی ان کے پہلے سامعین تھے:

"وہ میری بات نہیں سمجھتے تھے۔ میں ہر شام مایوس ہو جاتا اور ایک عجیب کرب میرے اندر پیدا ہو گیا تھا، شاید اسی دُکھ اور کرب نے مجھے آگے جا کر ایک ادیب اور فنکار بنا دیا۔ میرے مخاطب اَن پڑھ تھے، ویسے تو آج بھی بہت سے لوگوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری باتیں ان کے سروں سے گزر جاتی ہیں حالانکہ یہ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔"(۳)

اشفاق احمد نے ایف۔ اے کا امتحان رام سکھ داس (R.S.D) فیروزپور سے پاس کیا۔ گریجوایشن گورنمنٹ کالج لاہور سے کی۔ بی اے کیا تو پاکستان بن گیا اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور مزنگ روڈ لاہور کے ایک وسیع و عریض مکان میں سکونت پذیر ہوئے۔ بے روزگار تھے ملازمت کی تلاش میں نکلے، تعلیم بی اے تھی۔ جواب ملتا کہ اتنے پڑھے لکھے بندے کے لیے ہمارے پاس کوئی نوکری نہیں آخر میٹرک تعلیم بنا کر نوکری ملی جو ایک دن بعد چھوڑ دی اور مہاجر کیمپ میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ خوش گفتاری کے باعث اناؤسمنٹ پر ان کی ڈیوٹی لگی اسی مہاجر کیمپ میں اشفاق کی ممتاز مفتی سے ملاقات ہوئی اور پھر دوستی کا سلسلہ چل نکلا۔ مفتی نے پہلی بار اشفاق کو دیکھا تو ان کا خیال تھا:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.4 2021

”اشفاق احمد سے مِلا تو ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے تاگے سے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ اس کی بھرپور جوانی، جھلمل جھلمل کر رہی تھی اور اس پر انبساط کی پھل پتیاں ٹانکی ہوئی تھیں۔“(۴)

اشفاق نے ممتاز مفتی کو اپنے دوست ذوبی سے ملوایا جو ایک عظیم مصور اور فلرٹ آدمی تھا پھر اوپن ایئر تھیٹر میں اشفاق، ممتاز اور ذوبی کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اشفاق احمد اس محفل کو کشتِ زعفران بنائے رکھتے۔ ممتاز مفتی رقم طراز ہیں:

”اشفاق احمد اپنی ڈگڈگی اُٹھا کر میدانِ عمل میں آجاتا۔ سنہری باتوں کے غبارے ہوا میں اُڑتے، چٹپٹی لذیز تفصیلات کے پکوڑے تلے جاتے۔ جاذب توجہ کلوزاَپ، دِلنشیں تفصیلات، نقلیں، عکس، قصے کہانیاں، لوک کتھائیں۔ حتیٰ کہ اوپن ایئر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔ قہقہے گونجتے، تالیاں بجتیں، لارنس باغ کا سبزہ اور بھی سبز ہو جاتا، پھول سر اُٹھا اُٹھا کر مسکاتے۔ اس انبساط کا سرچشمہ اشفاق احمد تھا۔“(۵)

اب تک مفتی ایسے اشفاق کو جانتے تھے جو خوش گفتار اور خوش فکر تھا۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چلاتا، محفل سجاتا، داستان سناتا، نغمہ سرا اشفاق باغ و بہار شخصیت کا حامل ”اشفاق کی باتوں میں تفصیلات کی چاشنی تھی بات میں تفصیلات کی پھول پتیاں ٹانکتا۔ ساتھ ہی اس کی شخصیت سے انبساط کی پھوار اُڑتی۔ یوں اُڑتی جیسے فوارہ چل رہا ہو۔ اور وہ بھگو کر رکھ دیتی۔(۶) جب ذوبی نے اشفاق کا مجسمہ بنایا تو مفتی کو بڑی حیرت ہوئی ذوبی سے پوچھا:

”ارے یہ کیا بنا دیا تو نے

کیا بنا دیا اس نے پوچھا۔

یوں بنا دیا جیسے بالٹی اوندھی پڑی ہو۔

اچھا، وہ بولا، کیا بالٹی سیدھی پڑی ہے۔

لیکن بالٹی، کیوں، میں نے پوچھا۔

بھئی سیکڑ فیس ہے۔ اس نے جواب دیا۔

چہرے کی ساری لکیریں نیچے گرا دی ہیں تو نے

میں نے گرائیں، وہ بولا۔

اور کس نے۔

وہ تو خود گری ہوئی ہیں۔

یار اشفاق تو باغ و بہار آدمی ہے۔

ہاں ہے۔

گری ہوئی لکیریں تو دُکھی آدمی کی ہوتی ہیں

ہاں ہوتی ہیں۔

تو نے اشفاق کو دُکھی بنا دیا۔

اچھا، دُکھی بنا دیا۔

دیکھو تو سوچوں کا مارا ہوا، غمزدہ اکیلا۔

ہاں یار، وہ بولا مجھے جیسا دِکھا ویسا بنا دیا۔ اپنے پلے سے میں نے کچھ نہیں لگایا۔ اشفاق کے ساتھ چندماہ رہنے کے بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی باغ و بہاریت تو ایک پردہ ہے۔ دراصل وہ اکیلا ہے، چپ ہے، جلتا نہیں، سلگتا ہے، چڑچڑ کرتا ہے۔ سوچوں کا مارا ہوا ہے۔“(۷)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.4 2021

اِس وقت شقوا بھی اشفاق احمد نہیں بنا تھا لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کے مصداق فکر و دانش کے آثار تو شروع ہی سے ہویدا تھے۔ انھیں آگے چل کر دانش مشرق کی پہچان بنتا تھا۔ ان کی شخصیت کا رنگ سارے بہن بھائیوں سے مختلف تھا۔ مستقبل کا عظیم بابا"۲۔ مزنگ روڈ کی نیم چھتی میں مقیم تھا۔ یہ نیم چھتی گھر سے ملحق ضرور تھی، لیکن بالکل الگ تھلگ تھی۔ آنے جانے کے لیے کمرے میں داخل ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر کے صدر دروازے سے ایک زینہ اُوپر جاتا تھا۔ زِینے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ اس صحن میں نیم چھتی کا دروازہ کھلتا نیم چھتی ایک بہت بڑے کمرے پر بنی ہوئی تھی۔ پہلے روز جب میں نیم چھتی میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ چاروں طرف کتابوں کے ریک لگے ہوئے تھے۔ فرش پر یہاں وہاں کتابوں کے ڈھیرے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں، ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تمام زاویے نیچے کی طرف گرے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی پر سوچوں کی سلوٹیں تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے گرد اُداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔

میں گھبرا گیا، یا اللہ میں کہاں آگیا ہوں۔ یہ وہ اشفاق تو نہ تھا جس سے میں واقف تھا۔ یہ تو کوئی رابنسن کروزو ہے جو اس نیم چھتی جزیرے میں رہتا ہے۔

میرے نزدیک تو اشفاق، وہ اشفاق تھا، جو اوپن ایئر تھیٹر میں ڈگڈگی بجا کر محفل کو لالہ زار کر دیتا تھا۔"(۸) اشفاق کی شخصیت کے اُس رُخ سے ممتاز مفتی کو جہاں مایوسی ہوئی وہیں اشفاق کی جاذبیت بڑھ گئی۔ مفتی کو ان کی دورُخی شخصیت بھا گئی۔ مفتی ایک متجسس اور حساس انسان تھے۔ شخصیت نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتے اور انسان کے باطن میں جھانک کر اس کے افکار، جذبات و احساسات کی ایسی دلآویز تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ شخصیت زندہ اور متحرک اپنے پورے وجود کے ساتھ اِس طرح سے سامنے آجاتی ہے، گویا ہم کسی ہمدمِ دیرینہ سے محوِ کلام ہوں۔ اشفاق احمد اور ممتاز مفتی میں ایسی دوستی تھی جو صرف قدرت کی عطا ہوتی ہے۔ ڈھونڈھے سے نہیں ملتی مفتی، اشفاق کی خلوتوں کے رازداں ہیں اور پھر یہ وہ دور تھا جب اشفاق احمد کو قدرت "بابا" بنا رہی تھی۔ اشفاق کی وسعتِ فکر و نظر، کردار سازی اور شخصیت کی شفقت و محبت اسی "نیم چھتی" کی دین ہے، جہاں وہ غیر ارادی طور پر جہانِ نو کی تلاش میں اپنی ذات کا سفر کر رہے تھے۔ کبھی ڈوبتے کبھی نکلتے خان منزل کی رونقوں سے بے نیاز، تن تنہا، سوچوں میں گم، چپ چاپ پڑے رہتے۔

> "اس جزیرے کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اشفاق احمد صرف دُکھ اور چپ ہی نہیں ازلی اکیلا بھی ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کو کنارے لگنے نہیں دیتا جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو۔"(۹)

یہ تنہائیوں کے سلسلے بڑی دُور تک جاتے ہیں ان کے بغیر کبھی کوئی عظیم ذہن پروان نہ چڑھ سکا۔ کوئی دل پاک نہ ہو سکا۔ انسان کی حقیقت یکتائی ہے اور یکتائی تنہائی کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی اس حقیقت کو پانے کے لیے انسان کو کتنے وسیع و عریض صحراؤں، پہاڑوں، سبزہ زاروں اور گہرے پانیوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ نفسِ انسانی کی وسعت ان تمام مظاہر سے کہیں بڑھ کر ہے جن نفوس پر اللہ کی نظرِ کرم ہو وہ ان کے لیے تنہائی کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ انسان سارے تعلقات سے منہ موڑے یا جنگلوں کا رُخ کرے، بلکہ ذات کے اندر کی تنہائی اور معنی رکھتی ہے۔ ہر حساس فرد اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں:

> "جن وجوہ سے انسان معاشرے سے کٹ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے بے گانہ ہو جاتا ہے جس کی طرف عام طور پر رغبت ہوتی ہے۔ اس کی وہ پیاس جو دوسروں کو ایک چشمہ سے سیر اب ہوتا دیکھتی ہے لیکن خود ادھر مائل نہیں ہوتی جیسے جیسے رُوح بلندیوں کی طرف بڑھتی ہے اور عظمتوں کو حاصل کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ عظمت جسے قرآن قصۂ آدم کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ بالکل تنہا ہو چکی ہوتی ہے۔"(۱۰)

یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب رُوح کا احساس بیدار ہو جائے شاید یہی وجہ تھی کہ اشفاق احمد خان منزل کے ہنگاموں سے دُور، بے نام دُکھ کے مارے ہوئے نیم چھتی میں پڑے رہتے یہ بے نام دُکھ بھی تو انسان کو اپنی اصل سے دُور ہونے کا دُکھ ہے۔ اشفاق خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے اور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.4 2021

بچپن خوشیوں میں گزرا تھا۔ ان کے والد سخت گیر پٹھان تھے۔ ان کے حکم کے بغیر گھر میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا" جس گھر پر باپ اس قدر مسلط ہو کہ اس کے حکم کے بغیر پتا نہ ہلے تو افرادِ خانہ، اپنے تحفظ کے لیے۔ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے، ہیرا پھیری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بڑے خان کے گھر میں ہیرا پھیریوں کی چھچھوندریں چلتی تھیں۔ سب مل کر پلان کرتے، کہ جن کو کیسے قابو میں لیا جائے پھر پلان کو عمل میں لایا جاتا اور کامیابی پر جشن منایا جاتا۔

"اشفاق گھر کی ان رونقوں میں حصہ نہ لیتا تھا۔ گھر والے بھی اسے گھر کا فرد نہیں سمجھتے تھے۔"(۱۱)

یوں اشفاق اپنی ذات کا سفر کرتے رہے اور دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔ کچھ عرصہ مصوری کی لیکن جلد ہی ادب کی طرف راغب ہو گئے جوان کی اصل جولاں گاہ تھی۔ اشفاق نے کچھ عرصہ ملتان کے مہاجر کیمپ میں بھی خدمات سر انجام دیں پھر اپنے اساتذہ پطرس بخاری اور صوفی تبسم کے اصرار پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے اُردو میں داخلہ لیا۔ اس وقت ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" چھپ چکا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ صلاح الدین کے رسالہ "ادبی دُنیا" میں "توبہ" کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا۔ اشفاق کے پاس گفتگو کا خاص ڈھنگ تھا وہ باتوں کے رسیا تھے۔ جنسِ مخالف میں کشش تھی لیکن عام ادیبوں کے برعکس ان کے مزاج میں بیہودگی نہ تھی اور نہ ہی ان کی شخصیت میں جنس کا عنصر غالب تھا۔ مشرقی شرم و حیا کو پسند کرتے، خود بھی شرمیلے تھے اور آگے بڑھنے والی شوخ لڑکیوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ممتاز مفتی رقمطراز ہیں:

"اشفاق صرف اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا جو پرے ہٹ کر بیٹھتی تھی۔ اسے گدگدانے کی کوشش کرتا____ جو بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اس میں دلچسپی لیتا تھا جو حیا کے دوپٹے میں لپٹے جاتی، لپٹے جاتی۔ آگے بڑھ کر بات کرنے والی، بھڑک کر جلنے والی اور خود کو نشر کرنے والی سے وہ خوف زدہ تھا۔ کوئی بڑھ کر میدان میں نکل آتی یا اس کے انداز سے شبہ پڑتا کہ میدان میں نکل آئے گی تو اشفاق میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔"(۱۲)

اشفاق کو صرف باتیں کرنے کا شوق تھا وہ لڑکیوں کو باتوں کے جال میں پھنساتے اور جب وہ پیچھے پڑ جاتیں تو نیم چھتی میں آکر توبہ کرتے یہ توبہ کئی بار ٹوٹی اور کئی بار کی پھر ممتاز مفتی کے بقول ایک محترمہ منظرِ خاص پہ آگئی۔

"وہ محترمہ بڑی چترکار تھی۔ اندر سے قدیم اُوپر سے جدید۔ اُوپر سے سادہ مرادی اندر بن ٹھن ہی بن ٹھن۔ اُوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ اندر جذبات کی ہلچل، اُوپر ذہن ہی ذہن اندر دل ہی دل۔ وہ محترمہ دروپدی اور گیشیا کا سنگم تھی۔ وہ محترمہ متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت کو جانتی تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے تھی جو پیچھے ہٹنے والوں کو پہچانتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر انھیں پیچھے ہٹنے کی ندامت سے بچا لیتی ہیں۔ بڑے واقعات ہمیشہ چھوٹی سی بات سے جنم لیتے ہیں۔ ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے میں سے گزر رہی تھی۔ اشفاق نے سوچا کوئی منفرد بات کروں۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک آنہ دے دیجیے۔ کس لیے محترمہ نے پوچھا۔ سگرٹ پیوں گا۔

محترمہ نے اکنّی ہتھیلی پر رکھ دی۔ فتنہ وفساد کے ایوان کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔ پھر بات بڑھتی گئی۔ اشفاق احمد سارا دن موقع ڈھونڈتا، کہ ہاتھ پھیلا کر کہے ایک آنہ۔ محترمہ منتظر رہنے لگی کہ جیب میں ٹوٹی ہوئی اکنّی موجود رہے۔ بات بڑھی تو محترمہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔ اشفاق حیران رہ گیا۔ وہ "اب کیا ہوگا" کے فکر سے آزاد ہو گیا۔ اس لیے آگے بڑھنے لگا اور آگے اور آگے۔ یہ اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت تو موجود تھی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol 5 No.4 2021

لیکن فاصلہ کم ہونے کا خدشہ نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اِس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے واپسی
ممکن نہیں رہتی۔"(۱۳)

اشفاق کے دوستوں نے ان کی تبدیلی کو محسوس کیا۔ اشفاق اُداس، دُکھی اور چپ رہنے کے عادی تھے۔ کسی کو رازداں نہ بناتے۔ ایک دن اشفاق اور مفتی کے دوست محمد حسین نے مفتی سے کہا کہ اشفاق کو کچھ ہو گیا ہے لیکن مفتی نے یقین نہ کیا کہ اشفاق عاشق مزاج نہیں وہ خود محبوب طبیعت کا مالک ہے لیکن محمد حسین نے اصرار کیا کہ کوئی بات ہے۔ مفتی کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا:

"تجھے کیسے خیال آیا کہ محبت کا جھنجھٹ ہے۔
محمد حسین اس سوال کو سن کر گھبرا گیا۔ کہنے لگا جی وہ جو کالی بلی ہے اسے دیکھ کر میں نے سوچا شاید۔
کالی بلی۔ کون سی کالی بلی۔
ایک کالی بلی ہے۔ پتہ نہیں کس کی ہے۔ کہاں سے آتی ہے۔ وہ بلی نیم چھتی میں آتی ہے۔ اشفاق اس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے دُودھ منگوا کر رکھتا ہے، جب وہ آتی ہے تو اس کو بڑے شوق سے دُودھ پلاتا ہے، پھر اسے گود میں لٹا کر اس پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔
میری ہنسی نکل گئی، اس سے کیا پتہ چلتا ہے۔
نہیں، محمد حسین بولا، جب وہ کالی بلی پر ہاتھ پھیر رہا تھا تو خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ تلے بلی نہیں کوئی اور ہو۔
محمد حسین سچ کہتا تھا۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا جیسے بلی محض ایک علامت ہو۔"(۱۴)

بانو قدسیہ اشفاق کی کلاس فیلو تھیں۔ کلاس میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں لائق تھیں لڑکے لاپرواتھے۔ پہلے سال بانو قدسیہ اوّل رہیں تو لڑکوں کو بھی شرم آئی دوسرے سال اشفاق اوّل رہے۔ ان کے اساتذہ پطرس بخاری اور صوفی تبسم اگرچہ ادب کا گاڑھا ذوق رکھتے لیکن یہ انگلش کے اُستاد تھے۔ اشفاق کی کلاس گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے اُردو کی پہلی کلاس تھی۔ اشفاق کو جب بانو سے خطرہ محسوس نہ ہوا تو بہانے سے کوئی موضوع لے کر بحث کرتے رہتے اور ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ کہتے ہیں ایک بار ہیں نے بانو سے اقبال کے شعر "اِک دانش برہانی، ایک دانشِ نورانی" کی تشریح کرنے کو کہا تو وہ ایسے اُلجھ گئیں جیسے چڑیا دانہ چگتے ہوئے جال میں پھنس جاتی ہے۔ اسی دوران اشفاق احمد نے کشمیر ریڈیو کی ملازمت کی۔ ایم۔اے کے بعد اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پنجابی ادب پڑھایا پھر دیال سنگھ کالج میں اُردو کے لیکچرار بھرتی ہوئے دو سال یہ ملازمت کی۔ اس دوران میں بانو قدسیہ کے گھر جاتے رہے۔ بانو کی اُردو اچھی نہیں تھی وہ کینرڈ کالج کی پڑھی ہوئی تھیں۔ بقول اشفاق ہمدردی کو "ہمدری" لکھتی تھیں۔ اشفاق انھیں کچھ لکھنے کو دے آتے اور بڑے احترام سے یہ صفحات لے کر رکھ لیتے پھر ان کی تصحیح کرتے اس طرح بانو کی اُردو اچھی ہو گئی۔ اشفاق بظاہر بانو کے بھائی سے ملنے جاتے لیکن درپردہ روابط بڑھتے رہے۔ باپ سے ڈرتے تھے۔ کھل کے بات کرنے کی جرأت نہ تھی۔ بانو کی والدہ بھی اشفاق کے والدین کی رضا کے بغیر نہ مانتیں۔ اسی دوران میں روم سے اُردو لیکچرار اور براڈ کاسٹر کی طلب ہوئی تو اشفاق احمد وہاں چلے گئے اور دردِ اُلفت دل میں بسائے روم کے گلی کوچوں میں سرگرداں رہے۔ قیامِ روم ان کی زندگی کا منفرد اور یادگار تجربہ ثابت ہوا۔ وہاں اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کیے۔ اگرچہ اشفاق روم کی رنگینیوں میں کھوئے رہے لیکن اندر سے سوزِ محبت میں سلگتے رہے۔ واپس آ کر بھی نیم چھتی میں دل برداشتہ کالی بلی کو گود میں بٹھائے کہیں کھوئے رہتے۔ اشفاق کو کہنے کی عادت نہ تھی۔ مفتی اور محمد حسین پریشان تھے۔ محمد حسین صرف اس قدر جان سکا کہ اشفاق آج کل نہر والے بنگلے جاتا ہے۔ اتفاق سے ایک دن اشفاق، ممتاز مفتی کو لے کر کہیں گئے راستے میں نہر کنارے مفتی کو اُتارا کہ مجھے کچھ کام ہے خود اندر گئے کچھ دیر بعد واپس آئے تو مفتی نے دیکھا کہ کھڑکی میں شیشے کے پیچھے کالی بلی کھڑی تھی۔ مفتی، بانو کی ماں مسز چٹھہ کو جانتے تھے یوں بات کھلی، مفتی اور محمد حسین نے اشفاق کے بھائی ککھو کو شریکِ درد کیا جس کی مدد سے بامراد ٹھہرے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اشفاق کی خاکِ کوئے محبت میں آسودگی پا گئی۔ یہ سمن آباد کا چھوٹا سا کوارٹر تھا جہاں اشفاق احمد نے بانو قدسیہ کا ہاتھ تھاما اور پھر دونوں نے مل کر زندگی کی طویل، کٹھن اور پُرپیچ راہوں کو آسان اور خوشگوار بنا دیا۔ اشفاق کے گھر والوں نے ان کا بائیکاٹ کر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

دیا۔ دونوں سکرپٹ لکھ کر گزارہ کرنے لگے۔ کاروانِ زیست رواں دواں تھا۔ دونوں فنکار، حسین صبح و شام کے اسیر، عشق کے دام میں پھنس کر رہا ہو چکے تھے۔ دوسروں کے درد بانٹنا اور ہر روز دوستوں کو کھانا کھلانا ان کا مسلک بن گیا۔ مشکل وقت تھا لیکن وہ مطمئن تھے۔ قدرت ایسا اہتمام ہر کسی کے لیے نہیں کرتی نہ جانے خدا نے ان سے کیا کام لینا تھا کہ قدرت قدم قدم پر مہربان رہی۔ اشفاق نے جس وادی میں بھی قدم رکھا، حُسنِ فطرت نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ ان کا کہنا ہے:

> ”محنت کا تعلق کامیابی کے ساتھ نہیں ہے وہ تو خدا نے دینی ہے لیکن بشریت کی شان یہ ہے کہ وہ محنت سے جی نہ چرائے۔“(۱۵)

انھوں نے کبھی ضمیر کا سودا کیا نہ خود کو گرایا ورنہ اپنا آپ بیچ کر تو بہت سے لوگ مفادات حاصل کر لیتے ہیں اور خود کو کامیاب تصوّر کرتے ہیں۔ آج کا ادیب نام و نمود کی ہوس میں صرف شہرت کماتا ہے۔ کمال فن تو کیا فن کے نام سے نا آشنا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے تعلقات پیدا کرنا اور شہرت کمانا اس کا نصب العین ہے۔ میڈیا سے تعلق بجائے خود غلط نہیں لیکن دو نمبر ادیب اس کا استعمال غلط کر رہا ہے۔ کامیابی کے متعلق اشفاق کی رائے قابلِ تحسین ہے۔

> ”کامیاب صرف انبیاء تھے جو ایک چوکھٹے میں زندگی گزارتے تھے، اگر آپ بھی اسی چوکھٹے میں رہیں تو آپ بھی کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن زندگی میں ہر شخص کامیاب نہیں ہوتا، چاہے وہ اخبارات میں جتنی فوٹو چھپوالے اور بیان شائع کروالے وہ ایک کامیاب نام ہو سکتا ہے لیکن کامیاب انسان نہیں۔“(۱۶)

اشفاق نے کبھی خوشیوں اور آسانیوں کو خریدا نہیں بلکہ انھوں نے مشکل سے آسانی تک کا سفر اپنی ذات پہ دُکھ سہہ کے طے کیا اور یہ کامیابی محض سمن آباد کے چھوٹے کوارٹر سے داستان سرائے ماڈل ٹاؤن تک کا سفر یا میڈیا پر مقبولیت کا سفر نہیں بلکہ یہ مادے سے رُوح تک، انسان سے انسانیت تک اور انسانیت سے خدا تک کا سفر ہے جس کی مشکلات سے گزر کر اشفاق ”بابا“ بن گئے، جیسے درد حد سے گزر کر دوا بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان میں بابا بننے کی صلاحیت ہے لیکن یہ راتوں رات ہونے والا کام نہیں اور نہ جعلی عاملوں کے بس کا روگ جو عوام کو دھوکا دے رہے ہیں بلکہ یہ تو زندگی کے سفر میں خلوص اور دیانتداری سے منسلک ہے۔ انسان کے باطن میں جس قدر اخلاص پیدا ہوتا جائے وہ اسی قدر ”بابا“ بنتا چلا جاتا ہے جیسے اشفاق کی ذات کے سفر کی سمت شروع سے باباپن کی طرف تھی۔ محبت کے سفر میں اشفاق ہجر و فراق سے گزرے لیکن عام ادیبوں کی طرح اپنے مقام سے گر کر جنسیت کی طرف مائل نہ ہوئے بلکہ یہ سفر نیم چھتی میں کتابوں کے ڈھیر، کالی بلی اور روم کی رومانوی فضاؤں کے سہارے طے کیا۔ قیامِ روم کی تفصیلات کو ”باباصاحبا“ میں سمو دیا ہے۔ اشفاق احمد جہاں بھی رہے انھوں نے اپنے تشخص کو برقرار رکھا اور عالم شباب میں خود کو آلودگی سے بچائے رکھا۔ اے حمید کہتے ہیں:

> ”اشفاق احمد کا کردار شروع ہی سے بے داغ رہا ہے۔“(۱۷)

ایک دن والد صاحب نے اشفاق کو رُباعیاتِ عمر خیام دی کہ میں تمہاری شادی پہ کچھ نہ کر سکا یہ رکھ لو گھر آ کر جب کھولی تو دس ہزار کے نوٹ تھے۔ اس زمانے میں دس ہزار بڑی رقم تھی۔ اشفاق احمد آسودہ ہو گئے۔ اسی دوران میں ”داستان گو“ رسالہ بھی جاری کیا جو تین سال چلتا رہا پھر بند کر دیا۔ اشفاق کو آخری عمر تک حسرت رہی کہ میں ”داستان گو“ دوبارہ جاری کر سکوں۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی تحریر نہ پڑھتے تاکہ اسلوبِ نگارش متاثر نہ ہو اشفاق کا کہنا ہے:

> ”یہ ہمارے ہاں شروع سے رہا کہ نہ میں نے کبھی ان کی کوئی چیز دیکھی نہ اس پر تنقید کی اور نہ اس نے میری کسی تخلیق پر۔۔۔ اپنی اپنی راہیں الگ الگ ہیں، اب میں سمجھتا ہوں کہ وقت کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ کی آپا بھی ایک اور رُخ اختیار کر رہی ہے۔ رُوحانیت کا۔۔۔ ویسے بھی وہ تو خالص دین کی طرف مائل ہوتی ہیں۔“(۱۸)

ایک انٹرویو میں اشفاق احمد نے کہا کہ ہمارے خیالات ایک ہیں لیکن اسلوبِ تحریر جدا ہے۔ ایک ذہین نقاد آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ دونوں کا ادب دوسرے سے متاثر نہ ہوا، جیسے اشفاق کے ہاں "گڈریا" سے ہی تصوف کا رُجحان نظر آ جاتا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا لیکن بانو قدسیہ کی تحریروں میں فلسفہ غالب ہے۔"راجہ گدھ "اس کی بہت بڑی مثال ہے، جس سے اشفاق احمد بہت متاثر ہیں۔ اشفاق کی تحریر میں ایک غیر مرئی طاقت ہے۔ ایک قوتِ تسخیر ہے جو دلوں پہ اثر انداز ہوتی ہے۔

اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ ہماری کبھی لڑائی نہیں ہوئی بانو نے کبھی ایسا موقع ہی نہیں آنے دیا شاید یہ مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ چھوڑو اس سے کیا لڑنا۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ اشفاق کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی شادی بانو قدسیہ ہو گئی۔

> "اشفاق کی خوش قسمتی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی ایک سال وہ اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ عشق میں کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کر گھر آئی تو وہ محبوبہ نہ تھی بلکہ عاشق نکلی۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا۔ بیوی کی آمد کے بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا ہے تو درد بانو کو ہوتا ہے۔ ہتھ چکی اشفاق چلاتا ہے۔ تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک خالص پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات ذہن روح تیاگ رکھا ہے۔ بانو بہت بڑی مفکر ہے۔ وہ ہر بات میں صاحب رائے ہے۔ عقل و خرد سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جائے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل خرد دانشوری۔"(۱۹)

اشفاق اور بانو کی زندگی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ دونوں گورنمنٹ کالج لاہور سے بڑی عقیدت رکھتے اور اسے درسگاہ کی بجائے درگاہ کہتے اس کے متعلق ایک اثر آفریں واقعہ ان کے بڑے بیٹے کے بچپن کی بیماری کا ہے۔ انیق بیمار ہوا اسے اسہال اور قے کی شکایت تھی جو بڑھ کر تشویش ناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے نسخے آزمائے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے جون کا مہینہ تھا سخت گرم سہ پہر کا وقت، ڈاکٹر نے بچے کو دیکھ کر کہا کہ اب میں اس کا کیا کروں تم لوگ بہت دیر سے آئے ہو۔ پھر اس نے دوا دی تو انیق نے قے کر دی ڈاکٹر ناراض ہوا تو بانو قدسیہ نے اپنے دوپٹے سے کلینک کا فرش صاف کر دیا۔ بانو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھی ہوئی تھی دونوں مایوس کلینک سے نکلے۔ تھوڑا پیدل چل کر تانگے میں بیٹھے تو اشفاق نے غیر ارادی طور پر کہا گورنمنٹ کالج لے چلو، بانو حیران ہوئیں۔

> "کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے ماحول میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انیق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بو سی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا بڑا سا تھکا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک پیار سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گم گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی...... بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اترا اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔"(۲۰)

اشفاق بانو نے گورنمنٹ کالج لاہور کی "درگاہ" سے نکل کر ایسی گدڑی اوڑھی کہ پھر جہاں یہ جوڑا بیٹھتا وہ جگہ درگاہ بن جاتی اور وہاں سے لوگ زخموں کی شفا اور درد کا درماں لے کر اُٹھتے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد نواز کھرل (مرتب)، باتوں سے خوشبو آئے، لاہور: زاویہ پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۰

۲۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۲۱۸۔۲۰۹

۳۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۱۹۸

۴۔ الکھ نگری، ایضاً، ص ۲۸۰

۵۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۷۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۹۔ ممتاز مفتی، اور اوکھے لوگ، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۹

۱۰۔ ڈاکٹر علی شریعتی، علیؑ اور تنہائی، راولپنڈی: میکسیما کمپوزنگ سنٹر، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۱۱۔ الکھ نگری، ایضاً، ص ۲۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۱۳۔ اور اوکھے لوگ، ایضاً، ص ۱۱۳

۱۴۔ الکھ نگری، ایضاً، ص ۳۷۳۔۳۷۴

۱۵۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۳۳۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۱۷۔ اے۔ حمید، داستان گو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، س ن، ص ۳۲

۱۸۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۲۷۳

۱۹۔ اور اوکھے لوگ، ایضاً، س ۱۱۶

۲۰۔ صبحانے فسانے، ایضاً، ص ۲۷۴۔۲۷۵